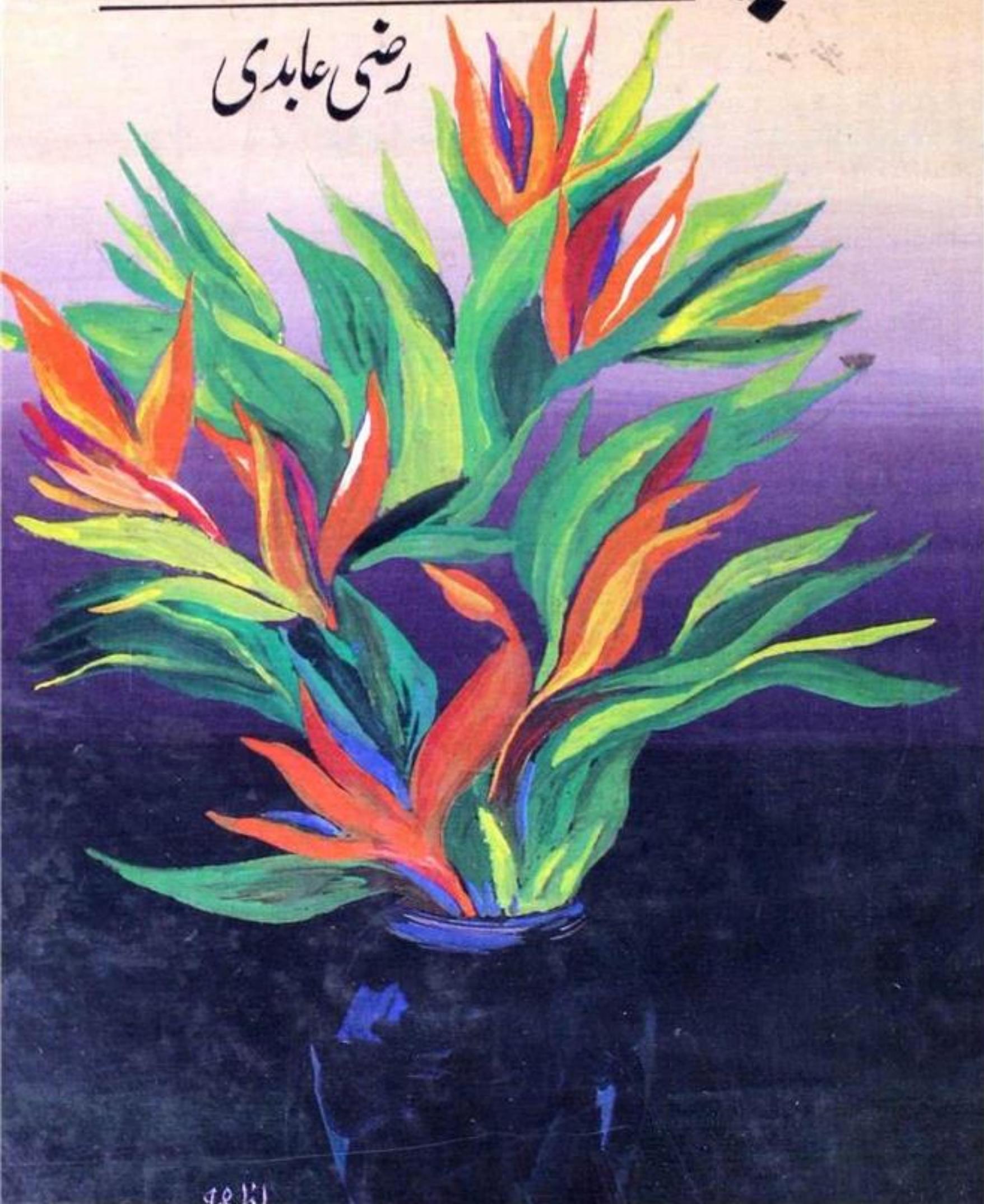


کُرْتِ عَزْلَیں کُجْنِ نَظَمَیں

رضی عابدی



رضی عابدی ۔ پنجاب یونیورسٹی لاہور کے شعبہ انگریزی کے چیئرمین رہ چکے ہیں۔ سونی پت، 'مشرقی پنجاب (بھارت)' میں پیدا ہوئے اور ابتدائی تعلیم دہلی میں حاصل کی۔

قیام پاکستان کے بعد لاہور آگئے اور پنجاب یونیورسٹی سے پہلے بی۔ایس۔سی اور پھر ایم اے انگریزی کیا۔ بعد ازاں کیمبرج سے ٹرائی پاس کی ڈگری حاصل کی۔ اردو اور انگریزی دونوں زبانوں میں تنقیدی مصائب ملکتے ہیں اور متعدد کتب کے مصنف ہیں۔ جن میں کچھ تراجم بھی شامل ہیں۔

ویگر تصانیف

اردو:

- 1۔ مغربی ڈرامہ اور جدید ادبی تحریکیں
- 2۔ تیسری دنیا کا ادب
- 3۔ اچھوت او گوں کا ادب
- 4۔ ہمین ناول ہنگار (قرۃ العین حیدر۔ انتظار حسین۔ عبد اللہ حسین)

انگریزی۔

The Tragic Vision

-1

Educational Chaos

-2

Search for Medium (in the Press)

-3

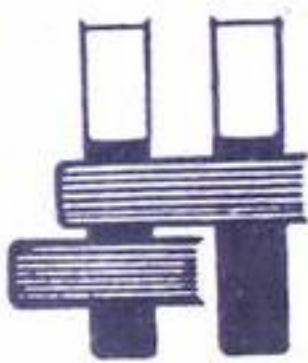
اور متعدد ترجمے

کُنٹرولیں پھر لیں

رضی عابدی

فکشن ہاؤس

۱۸- فرنگ روڈ، لاہور



جملہ حقوق محفوظ ہیں

نام کتاب = کچھ غزیں کچھ نظریں
شاعر = رضی عابدی
پبلشرز = فکشن ہاؤس
مزنگ روڈ، لاہور 18

فون: 7249218, 7237430

پرودوکشن = ظہور احمد خان / رانا عبدالرحمان
معاون = ایم سرور
پرنٹر = زاہد بشیر پرنٹرز، لاہور
سرورق = ریاظ
اشاعت = 1998ء
قیمت = 100/- روپے

انساب

ظاہر کامران کے نام

فہرست

غزلیں

- 11- کچھ زخم تجھے ڈھونڈ کے پانے میں لگے ہیں
- 13- اندر ہر غری کے شاہزادو! یہ رات بس ایک دو گھنٹی ہے
- 15- سورج کی شعاؤں کو باندھو۔ تاروں کی چمک کو قید کرو
- 17- یوں تو غبارے بھی کھلتے ہیں شوخی سے لہراتے ہیں
- 19- نہ محبت سے نہ ڈر سے نہ حیا سے انھیں
- 21- بات اتنی بھی نہ تھی جی سے اتر جاتے ہم
- 23- جو گیا پھر وہ یاد آیا نہیں
- 24- خواب دیکھیں گے تو پھر خواب پریشان ہوں گے
- 26- جس کو ڈھونڈا جئے چاہا نہ ملا
- 27- دل ہے تنہائی سے بیزار جو آیا ہوں یہاں
- 29- خل یہ ہونا پڑا عمر رائیگاں سے مجھے
- 31- چاہے بھلے ہوں چاہے برے ہوں ہر صورت تزپاتے ہیں
- 33- نیرنگ جہاں دیکھ کے خاموش ہوں ورنہ
- 34- یوں ڈھونڈنے کی دھن میں لگے ڈھونڈتے رہے
- 36- یادوں کی وادیوں سے ابھرتے ہیں چند سائے
- 38- اپنی بات سمجھنے والے جانے کب کے چھوٹے لوگ
- 40- نظر اداں، نظارے خموش، دل بیزار
- 42- سمجھئے کیا تیری بدلتی ہوئی نظروں کا گلا
- 44- جس کو آتا تھا وہ آیا جسے جاتا تھا گیا
- 46- کسی طرح تو برس ہو بہ ہوش یا بجنوں

قطعات

51

۱. آنسو

52

۲. آخر شب میں تڑپتے ہوئے ننھے تارے

آزاد نظمیں

55

۱. یہ اجائے یہ اندھیرے یہ ستاروں کا ہجوم

63

۲. نور ہی نور تھا

70

۳. چاندنی پچھلے پر

مادر علمی

75

۱. جامعہ پنجاب کی صد سالہ تقریبات پر

77

۲. وال عصر.....

نشری نظمیں

87

۱. نیا سال

89

۲. خوف

90

۳. نظریہ

92

۴. اپنا سایہ

93

۵. عزت

95

۶. ٹولی

98	-7	تحقیق
100	-8	مکتب
101	-9	اے اللہ
102	-10	خلاء
103	-11	عصمت
104	-12	نیا عالمی نظام
106	-13	الوداع

طنز و مزاح

113	-1	بزم مشاعرہ
118	-2	میں
123	-3	مشق سحر
127	-4	گرلز کالج
132	-5	شکوہ استار
134	-6	شکوہ طالب علم بخپور ممتحن محترم
139	-7	شکوہ اقبال
142	-8	واہ
145	-9	ٹینڈی

غزلیں



پکھڑ خم تجھے ڈھونڈ کے پانے میں لگے ہیں
پکھڑ تجھ سے محبت کے نبھانے میں لگے ہیں

اُن میں بھی جھلک پڑتی ہے اپنے، ہی لہو کی
جن لفظ ترے آئٹھے خانے میں لگے ہیں

تعیین تو کیا حسرت تعیین رہیں ہے
ہم پھر بھی ترے ناز اٹھانے میں لگے ہیں

وہ تیز ہوا ہے کہ بھی جاتی میں شمعیں
اور آپ اندر چیروں کو سجائے میں لگے ہیں

اک عمر سے انصاف کی زنجیر سمجھ کر
ہم پاؤں کی زنجیر ملانے میں لگے ہیں

صحراوں کے مزدور بھی تیشوں کو سنبھالے
فرہاد کو مجنوں سے ملانے میں لگے ہیں

خود ہی جو اٹھائی تھی ہر اک جبر کو سہہ کر
وہ ظلم کی دیوار کرانے میں لگے ہیں

کیا سادہ ہیں ہم سر کو تھہر تینخ جھکا کر
قاتل کو سیحائی سکھانے میں لگے ہیں

شاید کبھی ہم بارِ امانت بھی اٹھائیں
اب تک تو جنازے ہی اٹھانے میں لگے ہیں



اندھیر نگری کے شاہزادو! یہ رات بس ایک دو گھنٹی ہے
دلوں کے لھاؤ چمک اٹھے ہیں لہو کی ندی ابل پڑی ہے

تم اس کو قسمت کی بات جانو اسے مقدر کا کھیل سمجھو
ہر اُتنیں احمدقوں سے لینا یہ آزمائش بہت کڑی ہے

تمہارے قبضہ میں دکھ، ہی دکھ ہیں مگر سنوموت کے فرشتو
ہماری جھولی میں زندگی ہے جو سب دکھوں سے بہت بڑی ہے

ہماری آنکھوں میں آنکھیں ڈالو تو جان لو گے کہ اپنی بازی
زمیں کی پیداد سے کھنی ہے فلک کی رفتار سے لڑی ہے

شہر شہر جن کا سماں ہے وہ موت کا رقص ہو رہا ہے
انق پہ ایسے انار چلتے ہیں جیسے برسات کی جھٹپتی ہے

لسو برستی رہیں جو انکھیں اب ان سے شعلے سکھل رہے ہیں
ہماری دنیا یہ لگ رہا ہے کسی نئے موڑ پر کھڑی ہے

تمہاری خاطر سجائے کب کی ہمیں تو معراج مل چکی ہے
جو ہم اٹھا کر صلیب لائے تھے اب تمہارے لئے گڑی ہے

(بحوالہ اور جڑی کیپ)

(1988)



سورج کی شعاؤں کو باندھوتاروں کی چمک کو قید کرو
دامن تو بچانا مشکل ہے شعلوں کی ایک کو قید کرو

ایک ایک کرن کو قید کیا تو کتنے ظلم چمک اٹھے
اب رت ہے آتش بازی کی اس نجادھنک کو قید کرو

یہ المڑپن ہے پھوٹ پڑے گا دیواروں دروازوں سے
ایک ایک جھر کا چنوا دو ایک ایک جھلک کو قید کرو

ہم وقت یہیں ابن الوقت نہیں تاریخ بھی ہم تقدیر بھی ہم
پہناؤ نہ ہم کونہ بنجیریں رفتارِ فلک کو قید کرو

ہنستی انکھیں کھلتے چہرے جو تم سے نہیں دیکھتے جاتے
کلیوں کا پڑھنا بند کرو پھولوں کی مہماں کو قید کرو

انکھیں بھی بہت کچھ کہہ دیتی ہیں مونٹ نہ جب ہلنے پائیں
ایک ایک نظر ہنگامہ ہے ایک ایک پاک کو قید کرو

دل مجنوں ہے منصور ہے دل بیاک بھی ہے مجبور بھی ہے
روندا بھی گیا تو کیا ہو گا سبزے کی مہماں کو قید کرو

(1980)



یوں تو غبارے بھی کھلتے ہیں شوخی سے لہرتے ہیں
جن کا دھرتی سے ناطہ پوچھوں وہی کھلاتے ہیں

ختنے بجھ پر زخم لگے ہیں اتنا میں بھی لُٹما ہوں
اے میرا خوابوں کی جنت خواب بکھرتے جاتے ہیں

سوندھی سوندھی کھیت کی مٹی مان کسی خوشبو ہو
پتھر سڑکوں اندھی گلیوں ہم بھی کھو جگاتے ہیں

اپنے دکھ میں یہ دکھ بھی ہے نہ کوئی قاتل نہ مقتول
سچائی کا حرف ہے سولی ہم سولی جڑھ جاتے ہیں

نہ ہم گاہک نہ سوداگر، ہم سے لینا دینا کیا
پھر بھی ہیں بازار کی رونق دیوانے کھلاتے ہیں

مست ہواں بھی انکھوں سے دیوانے دل کیا دھریں
گھر پوں کی رفتار سے اب تو بض کی چال ہلاتے ہیں

بیتھر کے بھکوان کو راضی کرنا کوئی بات نہیں
بھکلتوں کا ڈر ہے تو یہ ایسے سوانگ چاتے ہیں

(1983)



نہ محبت سے نہ در سے نہ حیا سے اکھیں
بلیکھ جائیں جو بٹھا دے جو اٹھا دے اکھیں

دہ جو اک عمر سے لذت کشمیر می ہیں
ان سے کس طرح ترے پیار کے صدمے اکھیں

گذری جاتی ہے قیامت پہ قیامت دن رات
اب کوئی ثور پختکے گا کہ یہ مردے اکھیں

اور ہوں گے جو لئے پھرتے ہوں طوفانِ ل میں
ہم تو صحراء بھی نہیں ہیں کہ بکولے اکھیں

یوں بھی ہوتا ہے کہ فولاد سی بنیادوں پر
جب محصل ٹھہر نہ پائیں تو خرابے اکھیں

وہ جو ایک ایک ہیں گھیرے ہوئے دس دس کی جگہ
کیوں نہ پہلے انھیں فضل سے انھا کے انھیں

ایک ہم ہیں کہ نہیں کوئی شناسا اپنا
ایک تو ہے کہ ترے نام پہ فتنے انھیں

(1991)



بات اتنی بھی نہ تھی جی سے گزر جاتے ہم
اک نگاہِ غلط انداز سے مر جاتے ہم

اب تو یوں لگتا ہے بس غم نے جکڑ رکھا ہے
غم نہ ہوتے تو بھلاکب کے بکھر جاتے ہم

د پہر بھی نہ دھلی اور نہ پتھر، ہی کئے
شام ہوتی تو کہیں لوٹ کے گھر جاتے ہم

منزلِ شوق ہی، دیران پڑی ہے کب سے
ورنہ اس ماہ سے یوں غاک بسر جاتے ہم

بنجھ سے سادوں کی گھٹائیں تو نہیں مانگی تھیں
انتنے پیا سے تھے کہ اک بوند سے بھر جاتے ہم

کیسا کیسانہ زمانے نے تراش، ہم کو
سخت پتھر بھی جو ہوتے تو سنور جلتے ہم

دکھ کے صحراؤں میں چینوں نے قدم روک لیے
ورنہ انکھوں کے سمند میں اتر جاتے ہم

زرد چپ سے پہ تھا گذری ہوئی خوشیوں کا غبار
پیار کی بوند بھی پڑتی تو نکھر جاتے ہم

نہ بلا تے ہمیں محنسل تو سب بجا ہوئی
لوج احساس پہ دکھ بن کے ابھر جاتے ہم



جو گیا پھر وہ یاد آیا نہیں
ہم نے دنیا سے دل لگایا نہیں

آنکھ کھولو کوئی تو شمع جلاو
رات ہے گیسوؤں کا سایا نہیں

جانے کیا کیا شکائیں ہتوں
شکر ہے ہم نے آزمایا نہیں



خواب دیکھیں گے تو پھر خواب پر لشائ ہوں گے
ہم پیشیاں ہوئے اب آپ پیشیاں ہوں گے

آرزوں میں ابھی ناسور نہ میں بن پائیں
ظلم کے داع ابھی اور نمایاں ہوں گے

ہم نے آخر ابھی اس دور میں دیکھا کیا ہے
ہم جو حیراں میں ابھی اور بھی حیراں ہوں گے

اب نہ ہوگا میر شہزاد پہ ہما کا سایہ
اب اندر صیرے ہی اجالوں کے نگہبان ہوں گے

پکول سے چھرے اندھیروں میں دھلے جلتے ہیں
یہ الگ بات کہ شہروں میں چڑاغاں ہوں گے

درد مرٹ جائے کا تو ظلم سے بھر جائیں گے دل
باغ جب باغ نہ ہوں گے تو بیباں ہوں گے

حکم ہے قمری و بلبل کوئی شورش نہ کریں
کر گس وزارع سنانہ ہے کہ غزلخواں ہوں گے

ایک اک زخم سے اچھلے گا ابلت ہوانخوں
اپنے دیرانے اسی طرح فڑزاں ہوں گے

تختہ دار ہو، درے ہوں کہ بندی خانے
یہ مرے دور کے افسانے کے عنوان ہوں گے



جس کو ڈھونڈا جسے چاہا نہ ملا
یعنی ہم کو کوئی تجھر سانہ ملا

یوں تو ہر آنکھ میں افسانے تھے
جو نکا ہوں میں بسا تھا نہ ملا

زندگی موت، مجرت حسرت
تیرے ملنے سے ہیں کیا نہ ملا



دل ہے تنہائی سے بیزار جو آیا ہوں یہاں
درنہ میں اور تری معصوم نگاہی کا گماں

مجھ کو خود غرضی و بیدار کے الزام نہ دے
میں بھی آخر تو ہوں منجلہ ارباب جہاں

مسکراتے ہوئے ہوتُوں نئی ہیں وہ فریب
خندہ گل نظر آتا ہے مجھے طنز کناں

تلخی درد بدل دینی ہے فطرت کا مزاج
پھول چھپتے ہیں گذرتی ہے جو تنہائی گراں

کوئی پامال سی پامال ہے یہ راہِ حیات
اب تردد ہزڈ سے سے بھی ملتے نہیں قہم کے نشان

دسو سے ہوتے ہیں جب پیشِ نظر ہو منزل
راہِ ہستی میں بھلا کیا گلہِ ہم سفران

قصہِ درد نہیں شکوہِ احباب، مگر
مختلف ہوتی ہے کچھ سوزِ محبت کی زبان

(1965)



بخل یہ ہونا پڑا عمر رائیگان سے مجھے
 کہ ایک ربط رہا تیری داستان سے مجھے
 ہزار تر کی علت کے بعد بھی دل نے
 ترے فسانے سنائے مری زبان سے مجھے
 تری تلاش تو کرتا میں کو بکو بیکن
 یہ بام و در نظر آئے دھواں دھواں سے مجھے
 خرد کے نام پہ کارِ جہاں میں الجھا کر
 اٹھا دیا گیا جلوہ کے درمیان سے مجھے

بیر کیا ضرور کہ پہم شکائشیں ہی رہیں
مری نہیں سے تجھے تیرے آسمان سے مجھے

بھری بھار سے تنہائیوں سے یادوں سے
سدائیں آئیں میں تیری کہاں کہاں سے مجھے

یقین پہ کس کو بھروسہ ہے بدگمانی میں
تری نہیں میں زیادہ مزہ ہے ہاں سے مجھے

سنارا ہے کسی کا بنای کے افسانہ
بھی بس ایک شکایت ہے قصہ خواں سے مجھے

(1964)



چاہے بھلے ہوں چاہے بُرے ہوں ہر صورت ترپاتے ہیں
مہر دفا کی بات نہیں ہے دوست بہت یاد آتے ہیں

دنیا دھوکا مایا کھوٹی لوگ یہاں سب جھوٹے ہیں
کیسی کیسی باتیں کر کے ہم دل کو بھلاتے ہیں

دل ہی اپنا بس میں نہیں ہے دل ہی اپنا دشمن ہے
اور دل پر الزام نہیں وہ تو اپنے بن جاتے ہیں

کیسا ہندنا کیسا رونا ایک تماشہ ہیں دنیا کا
آرائش کا قمرہ جیسے جلتے ہیں بجھ باتے ہیں

تیرانام بھی لب پر لاتے اب اس واسطے ڈرتے ہیں
لوگ بہت ہیں اور لوگوں میں افسانے کھو جاتے ہیں

جبیسی، ہم پر گزری سب پر ایسی کچھ، ہی گزرتی ہے
جھوٹے سچے قصوں سے ہم کو نسی بات بناتے ہیں

یوں تو شاید کوئی ملا ہو لیکن بچھڑے کتنے دوست
جس کو کھو دیتے ہیں گویا صرف اسی کوہ پاتے ہیں

(1964)



نیزگ جہاں دیکھ کے خاموش ہوں ورنہ
ذی امرے افکار کی کچھ تنگ نہیں ہے

ہستی میں کب آئے تھے عدم سے نہیں معلوم
ہاں یہ ہے کہ جینے کا بھی ڈھنگ نہیں ہے

سر پھوڑ کے مرنے کی کسل سے بھی گذے
اب راہِ جنوں رہندر سنگ نہیں ہے

اک گئی افکار ہے دل چاہے کہیں ہو
اس شاہ کو لازم کوئی اوزنگ نہیں ہے

شاکی ہے فقط رسم و رہ اہل دفے سے
اتnar و شرِ عام سے دل تنگ نہیں ہے



یوں ڈھونڈنے کی دھن میں لگے ڈھونڈتے رہے

سورج کو بھی چسرا غیلے ڈھونڈتے رہے

ایسا تو کچھ پستہ ترا دشوار بھی نہ تھا

حالات سازگار نہ تھے ڈھونڈتے رہے

سو بار پاکے پھر وہی احساسِ تشنگی

تیری تلاش میں بہ کیسے ڈھونڈتے رہے

وہ بخط تھا - جنوں تھا۔ بہ حال خوب تھا

پھر ہم وہ تیرے غم کے مزے ڈھونڈتے رہے

یوں داغ بن کے رہ گئی جلوؤں کی دوپر
ایک اک کرن کو شام ڈھلنے ڈھونڈتے رہے

کھوآئے تھے جو خود کو ترمی رہ گذر میں، ہم
ہر ایک رہ گذر میں تجھے ڈھونڈتے رہے

سائے سے تیرتے تھے نگاہوں کے سامنے
شاید کوئی چراغ جلے ڈھونڈتے رہے

ہنگامہ شعور میں آسان نہ تھی تلاش
ادراک کی حدود سے پرے ڈھونڈتے رہے

میں تھا کہ کھو گیا تھا کسی کی تلاش میں
میرے حواس تھے کہ مجھے ڈھونڈتے رہے



یادوں کی وادیوں سے ابھرتے ہیں چند سارے
دیسیمہن سووں میں دور کی آواز جیسے آئے

یہ سرمنئی فضا سے جھپٹکتی ہوئی شفق
کیا کیا حسین این لوگ خیالوں میں لوٹ آئے

لکتنی حسین ہیں ترمی دنیا کی رونقیں
ہم نے قدم قدم پہنخوشنی سے فریب کھائے

تیری عنائتوں کے سوا یاد کچھ نہیں
آنے کو زندگی میں بہت انقلاب آئے

دل کو دیا ہے تیر سے تنفل نے بارہا
دہ درد جو سکون بھی دے ٹیس بھی اٹھائے

غمہا ے زندگی سے عقیدت سی ہو گئی
آنسو کچھ اس طرح تری آنکھوں میں جھللائے

مانوس اب تو ہونے لگا سوز غم سے دل
اب چشم التفات سے کہہ دو کہ مسکرائے

کس کس کو تیر سے بعد سناتے پھرے ہیں ہم
وہ داستاں جو آنکھ سنے آنکھ ہی سنائے

(1961)



اپنی بات سمجھنے والے جانے کب کے چھوٹے لوگ
دل کی ویرانی کا کارن پوچھ رہے ہیں ہم سے لوگ

سونے سونے سے لگتے ہیں تنہائی میں ہنگامے
ان را ہوں میں مل کر پکھڑے کیسے کیسے پیارے لوگ

اب ہم ایسے بکھر گئے ہیں جیسے موتی شب نم کے
پھولوں کی وادی میں لیکن اک دریا تھے اگئے لوگ

دہ بھی اک دنیا تھی جب انسان کو تھا انسان کاغم
یہ بھی اک دنیا ہے اب بیکانے ہیں نہ اپنے لوگ

دنیا دھر کا دل بھی دھوکا۔ دھوکے کی ہے جو ہے بات
پھر آخر کیوں دل والے ہی کھلا میں دیوانے لوگ

دل کی نالت دیکھ کے اکثر عقل بہک ہی جاتی ہے
ایک ہمیں سمجھانے آئے کیسے کیسے سیانے لوگ

ساری دنیا چھوڑ کے ہم نے اک دل کو اپنا یاتھا
لیکن دل کی راہوں میں بھی ڈال گئے کچھ کانتے لوگ

چاند ستاروں کی دنیا میں کب سے ہے انسان دکھی
ایک بھی انک خاموشی میں ڈوبے کیا کیا پیارے لوگ

اک دیوانہ پن کے سہارے اپنے من کی راہ کٹی
یوں تو ہمیں سمجھانے آئے جانے کیسے کیسے لوگ

دل کی خاطر اکثر ہم نے سوچ سمجھ کر دھو کے گھائے
ایک ہماری راہ میں آئے کیسے کیسے سیانے لوگ

ہم ہی تھے کہ قدم قدم پر کتنے پیارے سے کھانی چوٹ
ایک ذرا سی ٹھیس لگی تو صحراء صحرانکلے لوگ

پکڑے جائیں نہ روکے جائیں اف یہ نہ المدل کے چور
سیدھی سادھی باتیں ان کی سیدھے سادھے لوگ



نظرِ اس، نظارےِ خموش، دل بیزار
جنونِ شوق یہ منزل ہے یا کہ ذہنگار

نہ جو شِ آتش گل ہے نہ خوفِ برق و شرار
نسی نسی سی اسیری نسی نسی سی بھار

ذرا سی بات بنی اک فسانہ آخر کار
میری لگاہ کی شوخی تری نظر کا خمار

غم جیات کے مارے ابھی تو سوئے ہیں
ابھی نہ دے اے یہ سحر نوید بھار

غم جہاں، غم جستجو، غم جان
کہاں کہاں نہ ملا اک شکستہ دل کو قرار

تری، ہی یاد سہارا دٹے رہی ورنہ
کہاں گذرتے ہیں تھائیوں میں لیل و نہار

ترے بغیر انڈھیروں میں کھو گئے جلوے
تری نظر سے فروزان تھے ارزو کے دیار

نہ انتظارِ سحراب ہے اور نہ وعدہ شام
کہ رہ گیا ہے خلاؤں پہ زندگی کا مدار

نہ پوچھ کیسا یہ عالم ہو لے وحشت میں
گلوں کی آنچ سے بُجھنے لگے ہیں دل کے شرار

(1959)



کیجیئے کیا تیری بد لی ہوئی نظر دن کا گلا
محفلِ شب کے چراغوں کا دھواں بھی نہ رہا

بارہا محفلِ اغوار میں ایسا بھی ہوا
کان میں گونج گئی ہے کوئی مانوس صدا

ہم بھی کھاتے رہے میں صدم نکاہوں کے فریب
تم بھی دیتے رہے بہکے ہوئے جذبوں کو ہوا

تونے وعدہ تو کیا ایک فریب اور سہی
یوں بھی جی لیں گے کہ ذیباہے مسلسل دھوکا

میری کم مانگی اشک پر دلگیر نہ ہو
میرے پلو میں اک جام ہے چھلکا چھلکا

پھرستانے لگے محرومی قسمت کے خیال
طریقے مہرئیِ احباب سے دل ٹوٹ چلا

سازِ ہستی نہ رہے تشنہِ مضرابِ نظر
مرے ساقی مجھے انکھوں کے وہ نغمات پلا

کشمکش ہے غم دنیا و غم دل میں ابھی
تیرا آنا بھی مصیدت ترا جانا بھی بلا

(1959)



جس کو آنا تھا وہ آیا جسے جانا تھا گیا
تجھ سے اے بند بہ دل کچھ نہ ہوا پکھنہ بننا

میریہ دوست سمجھ کر جسے پہلو میں رکھا
اک دہی زنگ کبھی آگ کبھی پھول بننا

آنکھوں میں آنکھوں میں کٹی جاتی ہے تاؤں بھریات
عشق بدن ہوا جاتا ہے اب آنا ہے تو آ

اب کہاں انجم شوق کہاں جلوہ دوست
ہو گئے خواب وہ لمحے وہ زمانہ گزرا

سازخاموش بیں چدبات کو نیند آنے لگی
ساقی جام اُٹھا، جام اُٹھا، جام اُٹھا

بھملاتے ہیں ان آنکھوں میں محبت کے پراغ
جانے کیا ڈوبتی نظر دن نے فسوں پھونک دیا

راہ گم کر دہ مسافر کو نشانِ منزل
نوكِ مژگاں پہ جھلکتے ہوئے تارے سے ملا

اور تو کون سمجھتا تھا بھریِ محقق بیس
تیری آنکھوں کا فسانہ مری آنکھوں نے سنا

(1958)



کسی طرح تو بسر ہو یہ ہوش یا جنون
کہاں فریبِ تمنا کے تلاش کوں

میرے جنون کوں کی بن میرا حال زبوں
ترے کرم کا فسانہ بیان کروں نہ کروں

ترے خیال میں پھر کھو گئے ہیں قلب و نظر
ترے خیال میں پھر درد پار ہاہے سکوں

دیا ہے جام بلب ساقی ازل نے مجھے
دلوں کا درد، نگاہوں کا سوز، قلب کا خواں

جو یاد بن کے مرے دل کا درد ہو۔ میٹھے
ترے حضور میں وہ لمحے نذر پیش کروں

وفا کی تجھ سے تم تانہ بے رخی کا خیال
مرے جہاں میں رہا کیا کہ میں جیوں ہی جیوں

حضورِ حسن میں بیچارگی عشق نہ پوچھ
ہزار بار بھلاؤں مگر بھلانہ سکوں

مرے یے تو یہی زندگی ہے اب شاید
کہ تیرے حسن عنایات کو دعائیں دوں

وہ بات جس کی شکاعت ہے اک زمانہ سے
خطا معاف، مرے مہربان میں بھی سنوں

(1957)

قطعات

”سہنسو“

دل کے جذبات کی تفسیرِ جمیل
منے احساس سے لبریز ایا غ

نظرِ منتظر کی راہوں پر
مُٹھاتا ہوا منزل کا چڑاغ



آخر شب میں ترپتے ہوئے نسخے تارے
راز جب ہستی موہوم کا کہہ جاتے ہیں

میسری انکھوں میں جھلکتے ہوئے پیغم آنسو
ظلمت شب میں کہیں ڈوب کئے رہ جاتے ہیں

آزاد نظمیں



یہ اجائے یہ اندر ہیرے یہ ستاروں کا، بحوم
 ملگھی شام کہ یادوں کا محل ہو جیسے
 دوڑتا حدِ نظر تیرتے سائے
 جو کبھی
 بولتے ہیں کبھی چپ ہوتے ہیں
 جیسے سرگوشیاں کرتے ہوئے لوگ
 دور سے لگتا ہے خاموش چلے جاتے ہیں
 دور سے آتی ہیں جذبات میں ڈوبی ہوئی آوازیں

مگر
حقیقے ہیں
کہ

لرزتے ہوئے ہنڑوں سے نکلتی آہیں
کون جانے کہ حقیقت کیا ہے؟
یہ گذرتے ہوئے لمجھ کہ گذرتے ہی نہیں
سرد خالوں میں یہ محفوظ پرانی لاشیں
موت ہے لیکن عجب جائتی جلتی ہوئی موت
زندگی ہے مگر اس طرح کہ جیسے کوئی تصویر جئے

(۲)

ہر طرف
ایک جمود ایک سکون
یہ سکون بھی نہیں سنا ہے
جو کسی دور کی آواز کے احساس سے ہو جاتا ہے کچھ اور مہیب
اور بیوں لگتا ہے

جیسے

کہ ازل اور ابد
آج اور کل
اس میں یوں ڈوب گئے ہوں

جیسے

کہ کبھی تھے ہی نہیں
کوئی چاہت ہے
نہ چاہت کے نہ ہونے کا خیال
نہ کسی بات کی خواہش
نہ کسی سے وحشت
کوئی منزل نہ کوئی راہگذر

ہم جہاں تھے دیں موجود ہیں
ہر چیز دیں ہے کہ جہاں تھی
لیکن

پاؤں ہلتے ہوئے لگتے ہیں
اور ہم سوچتے ہیں

کریے اک قافلہ شام و سحر ہے
جس میں

ہم مسافر
کسی جانی ہوئی آواز کی دھن میں
ہمہ تن گوش پلے جاتے ہیں

(۳)

ٹھہرنا
تم نے پکارا مجھ کو
پنی آواز کے شعلے کو ذرا کم کر دو
اپنی انکھوں میں ذرا روک لوجذبات کی لو
میں تو سو کھے ہوئے پتوں کی طرح
ایک چینگاری سے جل انکھوں گا
اور یہ آگ
جو اک بار بھڑک اٹھے گی
پھر یہ تم سے بھی بسجھ پائے گی
ایک اک لفظ پہ دل کھینچا چلا آتا ہے

میں تمھیں ڈھونڈتا ہوں

وہ سنتیں میری طرف بڑھتی ہیں

مجھ سے قسمت نے کیا ہے یہ مذاق

خیس

تم اگر چاہو تو میں بال پریشان کر لون

تار تار اپنا اگر یہ بان کر لون

بھول جاؤں

کہ میں کیا ہوں

کہ میرا فرض ہے کیا

تم سے چاہت کے

ہر فی فکر کے

دنیا کے تقاضے

کیا ہیں

بھیگی انکھوں کے اشاروں پہ

ہر احساس کو قسم بان کر دوں

ہاں چلو یونہی سسی

بھھ سے تم کچھ بھی چاہو تو سی

(۲)

اگ ہی اگ ہے
جنگل کی دمکتی ہوئی اگ
شعلے اٹھتے ہیں
کہ ایک ایک درخت
ایک اک شاخ کو
ہر پتہ کو
آن کی آن جھلس کر رکھ دیں
یہ کن اس جنگل میں
کس قدر ٹھنڈا ہے
ان کو چھو کر دیکھو
کتنی خنکی ہے ان انگاروں میں
واقعی اگ ہے بیہ
یا فقط اگ کی تصویریں ہیں

یا کسی ذوقِ براہیمی نے
کوئی گلزار سجوار کھا ہے
مجھ کو پھولوں سے نہ بھلا د
میں بیتاب ہوں جلنے کے لیے

(۵)

میری محبوب
محبت کے تقاضوں کی قسم
میں نے تجھ کو کبھی چاہا، ہی نہیں
کہ مرے واسطے
پھولوں میں اور انگاروں میں کچھ فرق نہ تھا
مسکراہٹ بمحبے بھلاتی تھی
اور آنسو بھی بھلے لگتے تھے
مجھ کو معلوم نہ تھا
ڈھونڈھ کے پانا کیا ہے
میں نے جانا، ہی نہ تھا
پا کے کھونا تو نہ جانے کیا ہو

صرف کھونے کا تصور ہی بہت بھیانک ہے
 اور اب کھونے کے احساس نے پھر یاد دلایا ہے مجھے
 کہ مرے دل نے اس انجانے میں
 جانی پہچانی ہوئی را ہوں میں
 جانے کیا کیا کھویا
 اور اب موت کی وادی سے جو یہ آتی ہیں آوازیں مجھے
 تیری آواز کی جنبش نے جھنجورڑا ہے انھیں
 تیری آنکھوں نے انھیں
 زندگی دی ہے
 کہ جس کی خود انھیں
 اپنی دنیا میں توفیق نہ تھی
 ان اندر ہیروں میں اجائے ہیں تیرے ہونے سے
 اور اگر تو نہ رہے
 تو یہ اک خواب ہے
 ایک دہم ہے
 کہ جس کا شعور
 تیرے کسوجانے سے مرٹ جائے گا



نور ہی نور تھا

اور وہ تھا

جسے تھا بھی نہیں ہے بھی نہیں

اک سکون ایک خوشی

لیکن خوشی

جیسے سوئے ہوئے مغضوم سے ہنڑوں پر بسم کی کرن

زندگی موت

کوئی غم کوئی حسرت کوئی امید نہ تھی

صحیح تھی جس کی کوئی شام نہیں

فکر آزاد نہ تھا

آنکھ گرفتار نہ تھی
 بے نیازی تھی کہ جیسے ارم خواب و خیال
 یک بیک
 پہلی تخلیق ہوئی
 شوق بیدار ہوا
 جیسے ٹھہرے ہوئے پانی کو ہوا چھو جائے
 خود نمائی نے
 پرستاروں کو تخلیق کیا
 جستجو تھی کہ کوئی
 خود مجھے میرے مقابل کر دے
 اور اب سوچ رہا ہو گا خدا
 اُس نے کیا ڈھونڈ کے کیا پایا ہے
 اک سکون
 ایک خوشی
 خود نمائی کے پرستار کو منظور نہ تھی
 رینگتے

سلسلاتے ہوئے سانپ
ایک اک رگ میں اُتر آئے تھے

اور
کھینچے ہی لیے جاتے تھے
سیاہ اُن دمکھی ہوئی راہوں میں
بھید پانے کی تمنانے
خود ایک بھید بنادر والا انھیں

اب
سکون تھانہ خوشی
وہ فرشتے نہ وہ حوریں نہ وہ جزت نہ وہ کیف
اک وجود ہے
کہ وہ ہے ننگ وجود
یکن آدم کی یہ اولادا بھی سوچ میں ہے
اس نے کیا کھویا ہے کیا پایا ہے

یہ

زانوں کے

تھا تھے ہوئے انسان کی سوچ

اس سے الجھی

بکھری اس سے ٹکرائی

لڑکھڑاتے ہوئے قدموں سے

بہت دوزنکل آئی ہے

پھر بکھی

محسوس کیسی ہوتا ہے

جیسے اک دائرے میں گھوم رہا ہے انسان

ڈھونڈنا اس کا مقدر ہے

مگر

ڈھونڈنے کو تو یہاں کچھ بکھی نہیں

اک سفر ہے

مگر اس کی کوئی منزل ہی نہیں

جار ہے یہیں

مگر ہم کو کسی جانا بھی نہیں

جانے کیا !

ڈھونڈ رہے ہیں لیکن
 ڈینک تو پیس یہ گر جتے ہوئے گرتے گولے
 یہ بھی کچھ ڈھونڈ رہے ہیں شاید
 اور اگر

ڈھونڈ بھی لیں گے
 تو یہ کیا پائیں گے
 کتنی بیکار تلاشوں کا مسو!

جو شس ہے جذبہ ہے
 اور شوق کے ہنگامے ہیں
 گھری آنکھوں کی سیاہی میں کوئی ڈوب گیا
 کوئی اکھتی ہوئی چمنی کے دھوپیں میں گم ہے
 زندگی بھر کی تڑپ —
 اس کے ماتھے سے ٹیکتی ہے پیمنہ ہو کر
 غیرتِ عزم و لقیں کے باعث

اس کا احساس سوزنگ ہوا جاتا ہے

سمی نظریں

یہ بلکتی جائیں

یہ سسکتی آہیں

یہ کسے ڈھونڈ رہی ہیں جانے !

کون آئے

جو انھیں آکے تسلی دیدے

موت !

یوں تو ہر سمت نظر آتی ہے

ڈھونڈنے سے کہیں ملتی یہی نہیں

ڈھونڈنا کیا ہے

یہ پانا ہے کہ کھو دینا ہے

کتنے قیس آئے یہاں

محلوں کے لیے صحراؤں کو گلزار بناتے گذرے

کتنے فرہادوں کے
تیشوں سے چھانوں کے جگرخون ہوئے

قرن ہا قرن سے

یہ ڈوبت اٹھتا سورج

فکرِ انسان کی مجبوری

خون کے اشک بہاتا نکلا

خون کے اشک بہاتا ڈوبا

یہ حماقت

یہ تلاش بے سود

ٹھیک ہے ٹھیک

مگر

اس طرف دیکھو ذرا

میں تجھے ڈھونڈ رہا ہوں اب تک



چاندنی پچھلے پہر
 گدگداتی رہی سناؤں کو
 بارہاٹ گیارات کا تاریک جمود
 جانے کب صحیح ہوئی
 کسمائی ہوئی دھندر لائی ہوئی
 زندگی جاگ اکھی شوق نے انگڑائی
 مست ہو ہو کے محلنے لگی غنبوں میں ہوا
 اور کلیوں سے بدن — کھلتے رہے کھلتے رہے

بہکے جذبات کو
 ہونے لگی منزل کی تلاش

آستانہ مل گیا سجدوں کی فرداں کو
 پھر صنم آگئے کعبہ میں صنم خانوں سے
 شوق کو تاب نظر تک نہ رہی
 ایک ہی آس ایک ہی احساس
 آنکھ اٹھتی نہیں لب ملتے نہیں
 دل بیر بتاب — کوئی آئے کوئی آئے
 کھیلتے ہفتے ہوتے
 روٹھتے مرتے رہے
 میں نے تم کو کبھی قمر نے مجھے آنسو رلوٹے
 اور اک بار (کہ ہونا تھا یہی) روٹھ گئے چھوٹ گئے
 چاند فی الیسی بھپی
 سایہ تک پاس نہیں
 کون ڈھونڈے کے اب — کوئی نہیں کوئی نہیں کوئی نہیں

یاد کی بجلیاں
 رہ رہ کے چمک اٹھتی ہیں

زندگی کی یہ کشاکش یہ درد با میہ لوگ
 روشنی ہر تو نظر آتے ہیں
 اور اندر ہیروں میں تو یاروں کے سوا کچھ بھی نہیں
 جو ہے تو ہے جو نہیں ہے تو ہے
 باقی سب وہم و جنون و ہم جنون و ہم و جنون
 پھر مجھے آئے ہیں
 ہنستی ہوئی انکھوں کے پیام
 غنچے خود بن کے بھاروں کی نوبید آتے ہیں
 دعوتِ شوق پہاڑھے نہیں اب میرے قدم
 اک خلا ہے میں جہاں سوچ میں ہوں
 یہ دھڑکتے ہوئے دل
 کپکپاتے ہوئے لب
 اور پھر ————— کچھ بھی نہیں کچھ بھی نہیں
 کچھ بھی نہیں

مادر علمی

67

جامعہ پنجاب کی صد سالہ تقریبات

پر

عظمتِ جہہ و دستار کے دن آئے ہیں
کیا کہیں پھر سن و دار کے دن آئے ہیں

دیکھیں کس اس کے گلے پریہ چھرمی چلتی ہے
چشم بد دور کہ سرکار کے دن آئے ہیں

شیخ مکتب نے کیا جسہ مکتب خالی
رونقِ کوچہ و بازار کے دن آئے ہیں

محملیں بھی ہیں جھرو کے بھی ہیں دلوانے بھی
دعوتِ عام ہے دیدار کے دن آئے ہیں

چند نعمتوں میں سمت آئے فکر داش
علم پر چھل کی بیٹھا رکے دن آئے ہیں

کار طفلاں کی نہ پوچھو کہ ہوا کب کا تمام
اب تو ملاؤں کی بیگار کے دن آئے ہیں

اب چلیں گی نہ یہاں نقد و نظر کی باتیں
اب ذرا چھیر چلے بار کے دن آئے ہیں

1989)

وَالْعَصْرُ . . .

مال پر

سے پھر کی دھنڈلی سی خاموشی

اتری جاری ہے

اور عجائبِ گھر کی چھوٹی برجیوں کے لمبے سائے

جامعہِ پنجاب تک بڑھنے لگے ہیں

یہ عجائبِ گھر ہے جس میں

گذری صدیوں کی کھانی

منجم محمد محفوظ

سرپرستہ پڑھی ہے

اور اب

اس عجائبِ گھر کی چھوٹی برجیوں کے لمبے سائے

جامعہ پنجاب تک بڑھنے لگے ہیں
 جامعہ پنجاب کے گھریاں پر
 اب چار بجئے ہی لگے ہیں

آپ ہماری طالبہ ہیں
 ایسا لگتا
 کہ جیسے

پہلے بھی یہاں پڑھتی رہی ہیں
 آج سے کچھ سال پہلے
 آپ شاید آصفہ ہیں
 ”جی نہیں“
 تو پھر یقیناً نازلی ہیں
 ”جی نہیں“-

وہ تو میری سینئر تھیں
 آپ تو

سر

جب ہم یہاں سے جائیں گے تو

ہم کو بامکل بھول جائیں گے
ہمارے نام تک بھی
آپ کو تو پیارہ سکتے نہیں

بی بی

یہ ہمارا علم کار شستہ ہے
یہ قائم رہے گا
کیا بتائیں

چند سالوں سے عجب سا ہورہا ہے
لوگ آتے ہیں چلے جاتے ہیں لوگ
لیکن لگتا ہے کہ جیسے
کوئی آتا ہے نہ جاتا ہے کوئی
سال بسال

بس فقط نام بدلتے ہیں

یا

پھر ان کے ساتھ

بار بار آتے ہیں
اور آکے چلے جاتے ہیں
جامعہ پنجاب کے لھڑیاں پر
اب چار بجھنے ہی لگے ہیں

ادھر مغلوں کی پوشائیں پڑی ہیں
وہ علاموں کے زمانے کے نوازدہ ہیں
یہ برتن ہیں وہ زیور ہیں
یہ صناعی کے کچھ اعلانی نمونے ہیں
ادھر گوتم کے بت
اسن جمائے بس یونہی صدیوں سے بیٹھے ہیں
یہ کچھ
تاریخ کے کیپول ہیں
فاسلنڈ ہیں
کہ جن کو ہم نے
اپنے پھوٹ نوجوانوں کی اور رسائیں کی

تفریح کی خاطر
یہاں محفوظ کر کے رکھ دیا ہے

اور اب

اس عجائب گھر کی چھوٹی برجیوں کے لمحے سائے
جامعہ پنجاب پر پڑنے لگے ہیں

وقت کو روکو تو رک سکتا ہے

اس کے سو طریقے ہیں

پھرتے بازوں میں کلباتی بجلیوں کو
نگاہوں کی چمک کو

گیسو رخسار کی رعنائیوں کو

بند کیپولوں میں رکھ سکتے ہیں

لیکن

زندگی کب تک رکے گی

وقت سُھرے گاہان تک

یہ عجائب گھر ہے

اس میں زندگی تو مرچکی ہے
اس کے تیور رہ گئے ہیں
لیکن

اس عجائب گھر کی چھوٹی برجیوں کے لمبے سایلوں میں
ابھی کچھ زندگی ہے
جس کی لوٹڑ پتی ہے ابھی تک

ہاں - یہ ہے
کہ اس کے تیور بسجد گئے ہیں
اس کی زندگی پیشانی پہ جانے
کب نظر آنے لگیں تیوری کے بل
زندگی جب لیوں مقید تتو
تو کتنا خوف کتنا در نظر آتا ہے اس سے
جامعہ پنجاب کے گھر پال پر
اب چار بجھنے ہی لگے ہیں

اس کی سوئی پچھڑا آگے بڑھی
تو —

ایک لمبے میں ابھی گر چار نج جائیں
— تو —

عجائب گھر کی چھوٹی برجیوں کے لمبے سائے
خود بخود دھلنے لگیں گے

اور اپنے خوبصورت صاف اور شفاف
شیدشے کے گھروں میں
لوٹ جائیں گے
یہ عجائب گھر کی چھوٹی برجیوں کے لمبے سائے

(1989)

شی نظمیں

نیا سال ۱۹۸۷

سال گذر گیا

لیکن شاید نہیں گذرا

کہ ہم نے نوروز نہیں منایا

نہ گذرے برس کو پرانی شراب میں اندھیلا

سال کے گزرنے کی خبر تو آنے والا سال دیتا ہے

لیکن نیا سال کئی سال سے نہیں آیا

یوں لگتا ہے کہ وہی پرانا برس

ہر برس بہوت بن کر لوٹ آتا ہے

مردے کو اگر ٹھیک سے دفن نہ کیا جائے
تو اس کی روح بدر وح بنت جاتی ہے

جب تک پرانا سال دفن نہیں ہوگا
نیا سال نہیں آئے گا

چنگڑ مردوں کو دفن نہیں کرتے
نہ قمر بانگا میں بناتے میں

گذرے ہونے سال کا پیغام یہ ہے
کہ اب ہمیں

بھولوں اور پڑیلوں کے ساتھ جینے کا ذہب یکھنا ہوگا؟

خوف

خوف

چلچلا تی ہوئی سنسان دو پھر میں چیل کی آواز
نئے کھن امتحانوں سے گذرنے کا دھڑکا
مجت میں ٹھکرائے جانے کا خیال

خوف نے آدمی کو ہر طرف سے گھیرا ہوا ہے
لیکن

خوف

اگر بڑھتے ہوئے قدموں کو روکتا ہے
تو کچھ کر گذرنے کی دعوت بھی دیتا ہے
ہر خوف ایک جیسا نہیں ہوتا

خوف

قبرستان میں بھی ہوتا ہے
اور جنگ کے میدان میں بھی

نظریہ

نہ میرا بس اپنا ہے
 نہ میرا گھر اپنا ہے
 نہ میرا وطن اپنا ہے
 میرے کپڑے لندے کے ہیں
 میرا گھر متزوکہ جائیداد ہے
 اور وطن کی بات میرے مذہب میں حرام ہے
 کہ ہم بت پرست نہیں بت شکن ہیں

میرے آبا و اجداد بڑے جو شیلے تھے
 وہ اپنا اور دوسروں کا خون بہانے سے کبھی نہیں گھرا تے تھے
 اسی لیے وہ صاحبِ شرف و نسب کھلاتے تھے
 لیکن میری رگوں میں ان کا خون نہیں
 پیڑوں ہے پیڑو ڈالہ ہے
 میری شریانوں میں
 عربی عصیت کے ساتھ ساتھ
 یہ میونی طمع گردش کرتی ہے
 میں سود کھاتا ہوں
 اور زکوٰۃ دیتا ہوں

(1988)

اپنا سایہ

روشنی کے کھبے کے نیچے
 میں نے اپنے سر کو اپنے قدموں میں الجھتے دیکھا
 صرف اندھیرے ہی
 آدمی کو پریشان نہیں کرتے
 تیز روشنی کے نیچے بھی
 اگر آدمی ساکت کھڑا رہے
 تو اس کا سر
 اس کی ٹانگوں کی سلانخوں سے آزاد نہیں ہو سکتا۔

میں نے ایک قدم بڑھایا
 میرا سر پر ڈول کی قید سے چھٹ گیا
 میں قدم اٹھاتا رہا
 میرا قد بڑھتا رہا

عمرت

زندگی کے دو اصول ہیں
 ایک پیار۔ ایک طاقت
 اور پیار بہت یڑھی طاقت ہے

انسانوں نے مل کر کوشش کی
 تو پھاڑوں سے نہ ریں نکالیں
 صحراؤں کو گلزار بنایا

اور جب وہ ایک دوسرے کے خون کے پیاس سے ہجئے
 تو ہنسنے لئے شہروں کو کھنڈروں میں تبدیل کر دیا

انسان کو انسان بنایا
مجت نے - ہمدردی نے

حیوان صرف طاقت کی زبان سمجھتا ہے
گدھوں پر صرف ڈنڈ پر پڑتے ہیں
یہی ان کے لیے عزت کا میسوار ہے
جو پیار کی زبان سمجھتا ہے
کام وہ بھی کرتا ہے
لیکن پیار سے
عزت سے

(1991)

لُوپی

آج لُوپی کوئی نہیں پہنتا
 مگر کبھی
 لُوپی عزت کا نشان تھی
 فضیلت کی دستار تھی
 تاج کو جکلا ہی تھی
 لوگ سروں پر سجا تے تھے
 عجائے۔ طرتے۔ ترک لُوپیاں

جناح کیپ۔ سولاہیٹ۔ فیلٹ ہیٹ
 ٹوپی اپنے وقار اور
 دوسروں کے احترام کا نشان تھی
 سپاہی کی پسچان تھی
 عبادت کا سب س اس تھی
 کہ خالی سر پر شیطان دھول مارتا تھا
 ٹوپیاں اب بھی ہنسنی جاتی ہیں
 لیکن یہ جادو کی ٹوپیاں ہیں
 اگلے زمانوں کی نہیں
 کہ جنہیں اور رہ کر آدمی غائب ہو جائے
 آج کھل کی ٹوپیاں
 سروں پر نظر نہیں آتیں
 آنکھوں میں جھلکتی ہیں
 چتوںوں میں ظاہر ہوتی ہیں
 اب بھی ان میں بانکپن ہے

اب بھی اندازِ خردی ہے
اب بھی شملے کی لمبائی فضیلت کا پیمانہ ہے

لوگ بڑی بڑی ٹوپیاں پہنے پھرتے ہیں
مگر سچوں جاتے ہیں

کہ ٹوپی

اگر سر سے بڑی ہو
تو آدمی مسخرہ لگتا ہے

(1991)

تخلیق

اُدم شجرِ ممنوعہ کے قریب گئے
تو پہر دنیا وجود میں آئی

پھر جب یورپ سے
ڈاکو - چور - لٹیرے

ملک بدر ہوئے
اور اس طریقہ اور دوسری جگہوں میں پہنچے
تونی دنیا آباد ہوئی

اسی طرح شاید کل
 کرہ ارض سے کچھ بد کار نکالے جائیں گے
 تو وہ ستاروں میں نئی دنیا میں بسائیں گے

اے اللہ

کیا دنیا میں اسی طرح وجود میں آتی ہیں؟

(1991)

مکتب

جب مکتبوں سے علم اٹھ جائے
 اور عالموں کی زبانیں گنگ ہو جائیں
 تو پھر تی ہوئی جوانیاں
 طویل تجربوں کی بصیرتوں سے محروم ہو کر
 بھٹکنے لگتی ہیں

ایسے میں جب کہیں سے کوئی سبق نہ ملے
 تو زندگی خود درسگاہ بن جاتی ہے

مگر اس درسگاہ سے جو سبق ملتے ہیں
 ان سے علم کم
 اور عبرت زیادہ حاصل ہوتی ہے

اے اللہ

اے اللہ
 تو رحیم ہے۔ تو کریم ہے
 مگر تیرے بندے تیرے نام پر
 ایک دوسرے کا خون بھاتے ہیں

تو ان سے یقیناً حساب لے گا
 کہ تو عادل بھی ہے اور علیم بھی ہے

لیکن مجھے تیرا نام یعنی والوں سے
 ڈر لگنے لگا ہے
 اس پلے کہ
 تیرے نام پر نیکیاں بہت ہوئی ہیں
 لیکن ظلم ان سے کمیں زیادہ ہوئے ہیں

خلاء

زندگی میں کبھی کبھی
ایک خلاء سا محسوس ہوتا ہے
جیسے شاید کوئی کام ہونے سے رہ گیا
یا کوئی بات کہی نہیں جاسکی

ایک احساس زیاد ہوتا ہے
جو سمجھ میں نہیں آتا

کہ میں دور
دل کی گمراہیوں سے
ایک آواز اٹھتی ہوئی لگتی ہے

”جو ہونا چاہیے تھا نہیں ہوا
جو کرنا چاہیے تھا نہیں کیا“

عصمت

جب اقدار بے معنی ہو جائیں
 جب قانون کی تذلیل ہو
 تو غیرت کا خاتمہ ہو جاتا ہے

جرمنی نے آسٹریا پر قبضہ کیا
 مورخین نے اسے عصمت دری قرار دیا
 اور اس کے نتیجہ میں عالمی جنگ
 اور جنگ کے بعد جو کچھ ہوا
 وہ بہت ہولناک تھا

جب طاقت ہی اصول بن جائے
 تو عصمت کا تصور ہی ختم ہو جاتا ہے
 اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا
 کہ کس کی عصمت مجرد ہوئی

نیا عالمی نظام

امیدیں ٹوٹ جاتی ہیں
 لیکن جلد ہی پھر بندھ جاتی ہیں
 مایوسیوں میں زندگی نہیں گذاری جاسکتی

جب تک سانس ہے
 خواہشیں ہیں، دلوںے ہیں
 سکون، آرام اور خوشی —
 جدوجہد بھی یہی ہے، منزل بھی یہی

فتح زندگی کی ہوتی ہے

ناکامیاں انفرادی ہیں

بے معنی ہیں

پھول روزمر جھاتے ہیں

پھر بھی اکھلتے رہتے ہیں

(1991)

الوداع

میں نے زندگی میں کبھی پلٹ کر نہیں دیکھا
 لیکن زندگی پلٹ کر بار بار میرے سامنے آتی رہی
 اور آج بھی جب ایک دور مکمل ہو رہا ہے
 تو مجھے تیس برس کی طویل رفتاقتیں نظر آ رہی ہیں
 مسکراتے ہوئے چہرے جو شوق اور تجسس سے دمک رہے ہیں
 گول گول آنکھوں میں شرارت بھری چمک
 پکھھ جاننے کی تڑپ
 پکھھ کھو دینے کی خواہش
 چہروں سے چھلکتی ہوئی چاہت
 جو دیکھنے والی آنکھوں میں چاہتوں کے طوفان کھڑے کر دے

میں نے ان سب کو دیکھا ہے
 اور آج بھی سب کو دیکھ رہا ہوں
 فاصلے جیسے درمیان سے اٹھ گئے ہیں
 کیلنڈر ہر سال بدلتا ہے
 لیکن یہ صورتیں نہیں بدلتیں
 نہ میں بدلا
 ہر برس ایک نیا جوش
 ایک نیا دلوں
 لگتا ہے میں جہاں ہوں وہیں کھڑا ہوں
 اور وقت کی گارڈی میرے سامنے سے گذرتی جا رہی ہے
 لیکن اس میں بھی
 سب آنے والے چہرے وہی ہیں جو آگے جا چکے ہیں

 میری دنیا میں آج اور کل نہیں
 لیکن یہ نئے چہرے مجھے کچھ زیادہ بالغ نظر آتے ہیں
 انہوں نے زمانے کے اتار چڑھا دیکھے ہیں

ان کے دل امیدوں کے ساتھ ساتھ
خطروں سے بھی بھرے ہوئے ہیں
یہ وہ لوگ ہیں جنھوں نے اپنے ارد گرد
دنیا کو بنتے۔ بگرتے۔ بکھرتے اور ٹوٹتے دیکھا ہے

لیکن انھوں نے یہ بھی دیکھا ہے کہ گرد ہی رقبائیں
ایک مقام پر پہنچ کر ذاتی شفقتوں میں دُھل رہی ہیں

یوں لگتا ہے کہ ظلم اپنی انہما کو پہنچ رہا ہے
اور انسانی محنتیں بیدار ہونے لگی ہیں
اندھیرے سے چھٹ رہے ہیں۔ افت پر روشنی ہے
لیکن یہ روشنی میزائلوں اور ایمیم بموں کی نہیں
 بلکہ انسان کے اس اعتماد کی روشنی ہے
 جو بدترین حالات میں بھی ڈلگھا کیا نہیں

یہ چہرے دمکتے رہیں
یہ انکھیں چھپلکتی رہیں

میں بھی یہیں ہوں۔ آپ بھی یہیں ہیں
کوئی کہیں نہیں جائے گا

صرف وقت گذرتا جائے گا
صرف وقت گذرتا جائے گا

(1993)

طشود مزانج

بزم مشاعرہ

یوں تو ہر ایک بزم کی اپنی ہیں خوبیاں
 پر جو مشاعرے میں ہے وہ بات ہے کہاں
 کچھ فرق سامعین و مقتدر نہیں یہاں
 بزم سخن میں آ کے سب ہوتے ہیں گلفشاں
 ان کے اگر ہیں شعر تو ان کی ہے داہ دا
 اس سمت ہے مشاعرہ اس سمت دادرما

پر وازِ فکران کو دکھاتی ہے شاعری
 اور ان کو نغمگی سے سلاحتی ہے شاعری
 دیوانہ اپنی دھن کا بناتی ہے شاعری
 اس طرح اہل دل کو تاثانی ہے شاعری
 کچھ لوگ جھومنتے ہوئے کچھ اونگھتے ہوئے
 کچھ یوں کہ جیسے حسن بیان سونگھتے ہوئے

اس طرحِ محوبہ مکمالاتِ فن میں ہے
 رودادِ عشق سے اسے رعشه بدن میں ہے
 تعریفِ حسن سے وہ ادھرِ حسنِ ظن میں ہے
 ”یہ انجمانِ اک اور تیریِ انجمان میں ہے“
 ایک ایک شعر ایک کہانی لیے ہوئے
 ان کا پیام ان کی زبانی لیے ہوئے

زنگِ مزاح سے یہ اگر کھلکھلا اٹھے
 گرمی سے شعر کی وہ ادھر بدلنا اٹھے
 پچھوشت دت اثر سے اگر تملنا اٹھے
 ایسے بھی ہیں جنہیں نہیں نبتو بلنا اٹھے
 فرم اچکے جوش غسلِ طبع و اہ و اہ ہے
 آئے بھی اور اٹھ بھی گئے جلسہ گاہ سے

اس سمت بھی حضور کوئی کم ستم نہیں
 شاعر پہ کو نسل ہے یہاں جو کرم نہیں
 مانا کہ داد کا ہے انھیں اور غم نہیں
 بیداد سے یہ داد پہ کچھ ایسی کم نہیں
 ”ان کا گلا خروشِ ترجم سے پھٹ گیا
 تلوار سے بچا لورگِ گل سے کٹ گیا“

آنکھوں کے سامنے ہیں پریزادِ گلبدن
 شعروں کی تازگی سے وہ چہروں پر بالپین
 عالم یہ ہے کہ دیکھ کے یہیں رخ و ثران
 کچھ اپنا ہوش ہے نہ کچھ اندازہ سخن
 ”اللہ، کیا ہمارے یہ سب شاہکار ہیں
 ہم ہی جہاںِ حسن کے پروردگار ہیں“

اس سمت تو یہ جو شیہ خد بہ یہ اعتماد
 اور پشت پر وہ داد بہ اندازِ استقاد
 چشمک بھی ہے انہی سے ہی طلب ہے داد
 دلچسپی پر ان کے تحلف کا بھی تضاد
 چپکے سے کہہ رہے ہیں یہ اپس میں ”کچھ نہیں“
 چلا رہے ہیں ساتھ ہی ”تھیں آفریں“

پر صرف ہاؤ ہونہ میں امِ مشاعرہ
 بزمِ مشاعرہ میں ہیں صدرِ مشاعرہ
 تصویرِ اختیار نبھر مشاعرہ
 لا کر بٹھا دئے گئے نذرِ مشاعرہ
 خود تل رہنے یا گوہ سخن تو لئے نہیں
 سب بولتے ہیں آپ مگر بولتے نہیں

یہ داستان تو خیر ہوئی میں کہاں گیا
 اس انجمن میں ہے کہیں میرا بھی کچھ پتا
 خونِ جلگر نقش بنائے تو کیا ملا
 یہ دوستوں کا شغل یہ تھوڑی سی وادا

 شاعر کے حال پر یہ کرم بے پناہ ہے
 ”دیکھو مجھے جو دیدہ عبرت نکاہ ہے

(1961)

”میں“

مجھ کو بے اہری قسمت نے جزو نا شاد کیا
پی سی ایس نے نہ سی ایس پی نے مجھے یاد کیا
یوں ہر اک خوابِ حسین کو مرے بر باد کیا
نونہ سالانِ وطن کا مجھے استاد کیا
جب کہ میں بھی کسی مصروف کا نہ پایا مجھ کو
لا کے سقفِ راط کی مند پہ بٹھایا مجھ کو

بی بھی اعزاز بہر حال مناسب ہی ملا
اپنی دانائی پہ کچھ شک مجھے پہلے بھی نہ تھا
علم سے جا کے جماعت کو جو مرعوب کیا
کیا بتاؤں کہ اثر ان پر کچھ الٹا، ہی پڑا
بات بگڑی تو بہت تھی پہنائی میں نے
یعنی لیکھ پر کی جگہ چار پلانی میں نے

پھر بھی کانج سے ہی وابسطہ ہو روزی تو حضور
 نہ سی عالم مگر عالم کا چرچا ہے ضرور
 کوئی میدايز علیم یکنین ہو شمع کہ حور
 اس انہ صیرے میں تو ہے ایک کرم مطلع طور
 ایک نکتہ جو کہ میں کام کا پایا میں نے
 جا کے دو گلے میں بہت شور مچایا میں نے

مولپا، گولکی، سفراط، غزالی، ایڈلر
 گوٹے، شیکسپیر، میر، قافی، ہومر
 ہکلے، مارکس، شوپنہار، میکالے، اپدیلر
 ماڈنے، ڈیم، ہر سچیف، کینیڈی، ہٹلر
 لفظ اک ٹھوس حقیقت ہے خود اک ذات ہے نام
 در نہ معنی کی تو ہے وقت کے ہاتھوں میں لگام

یہ دیکھنے کا اور اس کو فرستہ شدن ہے
 موربڈ ذہن یہاں اور وہاں الگھن ہے
 یہ پروگریسو۔ وہ کلاسک ہے وہ ماڈرن ہے
 الغرض حضرت نقاد کو از برفن ہے
 اس قدر سهل یہ اعزاز جو پایا میں نے
 ذوقِ تنقید کو سینہ سے لگایا میں نے

مجلسیں اب تو بپا ہونے لگیں شام ڈھلے
 اہل فن اہل خشد حلقة یاراں میں جئے
 پچھکی تھی ہی نہیں اہل عقیدت کھابھے
 لکھر لائے کئے تھے کہ دجہاں ہاتھ لگے
 اک عجب رعب تھا ارباب سخن پر طاری
 نطقِ عالی سے ہونے فیضیں کے دریا جاری

جوش کو اور کبھی آزاد کو مطعون کیا
 نے اس ایلیٹ کو منافق کبھی مکار کیا
 قرۃ العین کے نادل کا ادھیرا سنجایا
 وقت موقعہ کے مناسب میں ہرگز راہ چلا
 اور جب اقبال کی عظمت کے ترانے گائے
 ریڈیو سے بھی مجھے نشر کے پیغام آئے

خوب ہرگز سے یوں میری پدر اُنی ہوئی
 حلقة اہل صحافت میں شناسانی ہوئی
 پھر تو ہر بات سند تھی مری فرمائی ہوئی
 اب نہ پوچھو کہ یہ کیوں حوصلہ فزانی ہوئی
 ایسے اوصاف تو لے جاتے ہیں برباد میں
 میں ایڈیٹر کے رہا حاشیہ برداروں میں

نشرگاہیں ہوں کہ مکتب ہو کہ ہوتقدیم
 ان کا انداز نرالا ہے جدا ان کا ہے فن
 محفلِ شعر و ادب ہو کہ صحافت کی لگن
 ایک سے ایک کرشمون کام مرقع ہے وطن
 ”پاؤں اٹھتے ہی نہیں راہ میں بڑھنے کیلئے
 کتنی قبریں ہیں یہاں فاتحہ پڑھنے کیلئے“

(1961)

مشقِ سحر لہ

”اقبال اک برس جو مراتاج سر ہوا“

مردہ رگوں میں خونِ جوان کا رگر ہوا

درماندہ راہرو کو پیام سفر ہوا

حکم پر یہ یعنی بوقتِ سحر ہوا

صف بستہ ہر جوان ہوا آب و تاب سے

کیڑوں کی فوج گونج کے نکلی کتاب سے

چپ راست کا یہ ظلم یہ دھلتی جوانیاں

پھیلے ہوئے یہ زاویے سمٹے ہوئے جوان

بازو یہ کورے کورے یہ مستور پنڈ لیاں

پیر فلک کی ان پہ پڑی تھی نظرہ کہاں

مشقِ سحر کا حکم جو اک بار ہو گیا

”عالم تمام مطلع انوار ہو گیا“

لہ ایوب خاں نے حکم دیا تھا کہ سب پر دنیسر پر یہ کیا کریں۔ لوگ اس سے ناخوش
تو نتھے۔ مگر فوراً بعد ہی کچھ تحریکیں جوانوں کی شادیاں جائزی تھیں۔

جو مستعد تھے سارا جہاں ڈھونڈتے پھرے
 یعنی کرنیکروں کی دکان ڈھونڈتے پھرے
 پکھ ناز نین طبع اماں ڈھونڈتے پھرے
 ایک ایک ڈاکٹر کا مکاں ڈھونڈتے پھرے
 پکھ تو ہوئے علیل دوانے بچا لیا
 پکھ صاحبین کو بھی خدا نے بچا لیا

قسمت سے ایک اور بھی نکلی رہ فرار
 یعنی وہ لوگ جن کا ضعیفوں میں ہے شمار
 ان کو دیا گیا ہے نہ آنے کا اختیار
 اب ہیں جوان اپنی جوانی پہ شرمسار
 یہ جوش اک ثاب کا آئندہ دار ہے
 ”پیری کے ولے ہیں خزاں کی بھار ہے“

لہ پکھ کو اعتراض نہ کہ درزش کا لباس غیر شرعی ہے

میداں میں آگئے وہ مجادہ پڑے عمل
 یہ بازوؤں کا لوح کمر کا یہ کس یہ بل
 اک اک قدم اٹھا کے وہ رکھنا سبھل سن بھل
 مشکل میں ہے قبیلہ سقراط آج کل
 خودا پتے زور میں جو بڑے لڑکھا گئے
 گرنے پر انکشاف ہوا گھاس کھا گئے

اس لا جواب مشق میں نگرت کا کیا سوال
 ان کا ہے رُخ جنوب تو ان کا ہے رُخ شمال
 یہ ہیں ہر ن کی چال وہ ہیں فیلم سرت حال
 ان کے خرام ناز میں ٹੁٹن کا ہے جمال
 کس کس کی کیا ادا ہے بتاؤں کسے کسے
 ”آئندہ کیوں نہ دوں کہ تماشہ میں جسے“

میدان سے ایک ایک قدم مانپتے ہوئے
 واپس ہوئے میں ضعف میں اب کا نپتے ہوئے
 عربیانی بدن کو ذرا ڈھانپتے ہوئے
 آکر وہ کرسیوں پر گرے ہانپتے ہوئے
 پھیلی میں عارضوں پہ شعائیں وہ نور کی
 ”پڑتی ہے آنکھ تیرے شہیدوں پر خور کی“

ناخوش گواریوں تو ذرا ہے یہ روئی داد
 بہتوں کو لیکن اس نے دکھائی رہ مراد
 ما یوس ہو چلے تھے بزرگانِ خوش نہاد
 حاصل ہوا ہے پھر انھیں اگلا سا اعتماد
 اے مشقِ صبح وہ ترمی کامیابیاں
 یاروں نے کس مزے سے رچائی ہیں شادیاں

گرلز کالج

یکاک جو کالج کی گھنٹی بھی ہے
 تو رونق گراونڈ کی گھنٹنے لگی ہے
 کلاسوں کا احوال اب دیدنی ہے
 کبھی سورغشل ہے کبھی خامشی ہے
 ”نہیں بولتی ہیں تو کب بولتی ہیں“
 مگر بولتی ہیں تو سب بولتی ہیں“

ابھی مرس جماعت میں آئی نہیں ہیں
 توحالات کس درجہ شورہ آفریں ہیں
 شکیلہ کہیں ہیں جمیلہ کہیں ہیں
 پچھڑ جو گئی ہیں تو چیں برجیں ہیں
 یہ ان کے بلانے کو چلا رہی ہیں
 وہ ان کو اس شاروں میں سمجھا رہی ہیں

سپرے آپس کی جھگڑے لڑائی کی باتیں
 تو فوراً ہی صلح و صفائی کی باتیں
 یہ اس کی بہن اس کے بھائی کی باتیں
 غرض اک زبان اور خداوی کی باتیں
 فقط اپنی دصون ہے پرانی نہیں ہے
 یہاں پر کسی کی سنائی نہیں ہے

خدا جانے لیکن یہ کیا ماجرا ہے
 کہ یوں دفعتاً شور و غل تھم گیا ہے
 یہ احساس پاگرہیں اب ہوا ہے
 کہ ٹیکر تو کسی پہ رونق فزا ہے
 یہ ضبطِ مجسم یہ حسنِ مکمل
 یہ ساری جماعت کا مقصدِ اول

یہ نوکِ مژہ کی اک ہلکی سی جنبش
 یہ رفتارِ گفتار میں حسن کاوش
 یہ تمکینِ خاطر یہ انداز پوشن
 غرض ہر ادا جان لینے کی خواہش

یہ پُر کاری و بے نیازی کا عالم
 عنائت، نوازش زیادہ نہ کچھ کم

شرع اس طرف ہو گیا ان کا لیکچر
 مگر اس طرف ان کو ہے شغلِ دیگر
 بیوں کی ہو جنبش کہ دامن کی سر
 نظر جائزہ لے رہی ہے برابر
 پچار ان کو دیوی کا ہر آنگ بھائے
 تبسم کوئی بنے نظر رہ نہ جائے

نگاہوں نے کچھ اس محبت سے دیکھا
 کہ محسوس ہونے لگا اک نشہ سا
 یہ خود اعتمادی یہ غمزہ بلا کا
 نہیں کوئی دنیا میں اب اپنے جیسا
 زمانے کے یوں بیش و کم دیکھتے ہیں
 کہ اپنا ہی دم اور قدم دیکھتے ہیں

یہ ذہنوں پر ہر خط چھانے کی کوشش
 ہر اک دل پر سکھ بٹھانے کی کوشش
 جو سیکھا ہے سب کو سکھانے کی کوشش
 ہر طو ان کو پڑھانے کی کوشش
 جو شکل ہے آسان ان کے لیے ہے
 دل ان کے لیے جان ان کے لیے ہے

کبھی قابلیت کا سکھ بٹھا کر
 اسے ڈانٹ کر اس طرف مسکرا کر
 کبھی ایک رونی سی صوت بنایا کر
 وہی آزمودہ ادائیں دکھا کر
 غرض حسب توفیق ہر کام کرنا
 جماعت کو جیلوں سے یوں رام کرنا
 یہ بازی گردی ہو گئی ان کی قسمت
 مگر اور بھی تلخ تر ہے حقیقت
 نہ ہو گر جماعت کی نظرِ عنائت
 نہ مکتب سے باہر نہ مکتب میں عزت
 معلم کی ملت کو بردا نہ ہو جب
 مُربی میں پھر اس کے طفلاں مکتب



پیغم اک درد ہے اک مفت کی رسوانی ہے
یعنی شگرد ملے ہیں یہ سزا پائی ہے

نظر بیان کی بھی کلاسوں پہ لگی ہیں لیکن
دل نے آوارہ مزاجی کی قسم کھائی ہے

دہ جو کالج کے تھے مقتول بقولِ ابیر
ان کے ہاتھوں اب ہر اک جان پہ بن آئی ہے

شعر کے حسن کی ہے نوٹس کی سطروں میں تلاش
غالب و میر کو شامت یہ کہاں لائی ہے

نست نتھے پیدا کئے جاتے ہیں تنقید میں زنگ
شیلے مجنوں ہے کہیں باڑن ہر جانی ہے

کوئی شاعر ہو مصنف ہو کہ افسانہ نگار
داخلی، خارجی صفوادی ہے سودائی ہے

شیکسپیر سے ہو نسب تو ہر لغو سی بات
مبلغ علم ہے عرفان ہے دانائی ہے

اور پھر اس پہ یہ دعوے کہ یہ ساری تحقیق
لیکچر رنے ہی بڑے شوق سے فرمائی ہے

یہ سب افکار کئے جاتے ہیں مجھ سے نسب
میں نے ناکردار گناہوں کی سنہ پائی ہے

(1962)

شکوہ طالب علم حضور ممتحنِ محروم

میں نے سیکھا ہے کہ ہر ظلم پر خاموش رہوں
آپ فرمایا کہ میں ہمہ تن گوش رہوں
بس بدقیق یاد رکھوں خود سے فراموش رہوں
آپ کے خمکدہ علم کا مئے نوش رہوں
یہ شکایت زرہ مشق سخن ہے مجھ کو
ممتحن! آپ سے خاکم بدہن ہے مجھ کو

نشہ عشق کو چھوڑا غم ابجد میں پھنسے
گیس پیر زکمیں لائے کمیں نوٹس لیے
کون سے غم تیری خوشنودی کی خاطرنے سے
ممتحن میسر مگر تجھ سے خدا ہی سمجھے
ایک نمبر نے لی جاں سوتھے سامانوں کی
حالت میں ہو گئیں پہلی سی مسلمانوں کی“

تو ہی کہہ دے کہ کبھی تیسرا می گلی کو چھوڑا
 تیرے احباب تیرے دست کسی کو چھوڑا
 داسٹے دینے میں اللہ و نبی کو چھوڑا
 ” بت گری پیشہ کیا بت شکنی کو چھوڑا
 پھر بھی ہم سے یہ گلہ ہے کہ وفادار نہیں
 ہم وفادار نہیں تو بھی تودل دار نہیں

سال بھر عیش سے آرام سے کالج میں کٹا
 کچھ پڑھائی کی خبر تھی نہ لکھائی کا پتہ
 نہ تو استادوں کا کہنا نہ بزرگوں کا سنا
 جذبہ شوق نے لیکن یہ بڑا کام کیا
 تھے سوالات تو بھم پہ نہ چھوڑے ہم نے
 بخوبیات میں دوڑا دئے گھوڑے ہم نے

مختصر ہم نے اگر لکھ دیا نہ رہنے ملے
 اور زیادہ بھی جو لکھ آئے تو بہتر نہ رہنے ملے
 یعنی دو چار چھڑا سس سے کبھی ڈرکھ کرنے ملے
 پاس ہونے کے یوں کہئے کہ برابر نہ رہنے ملے
 ہم نے یہ بات کہی ہے تجھے وہ بھائی ہے
 "بات کہنے کی نہیں تو بھی توہر جائی ہے"

اب ہے درکار سیاہی نہ قلم اور نہ نب
 کہ جوانی خود ہی مطلوب ہے خود ہی طالب
 دل آزاد بھلا کیوں ہو رہیں کاتب
 "عشق پر زور نہیں ہے یہ وہ آتش غالب"
 ہم کو دینے تھے جوابات سوالوں سے غرض
 کھل کے دیتے ہیں سخنی مانگنے والوں سے غرض

تجھ کو معلوم ہے ہم نے کبھی لکھا نہ پڑھا
 ہم جماعت تھے ہمارے سو بڑے ہی علماء
 جس طرح ان کو اسی طرح ہمیں بھی پرکھا
 تو نے شاہین کو ممولے سے لڑایا۔ اچھا
 داد دے دل کی کہ کس غیظ سے پرچوں پہ پڑا
 ورنہ اس طرح سے بے تینغ و تبر کون لڑا

ہم نے کہنا نہ سنائھیک یہ الزام بجا
 وقت کو ضائع کیا کچھ نہ کیا کام بجا
 ذہن رکھتے ہیں بہت کندہ بہت خام بجا
 کچھ ہمارے لیے ہونا تھا خوش انسجام بجا
 مشوروں سے بھی نصیحت سے بھی انکار نہیں
 ” ہم سخن فہم ہیں غالب کے طرفدار نہیں ”

کہتے ہیں ہم میں سے کچھ پر ابھی کنڈلشیں ہے
 مستحقِ رحم کے ہیں آپ پہ بھی روشن ہے
 حل جو پر پھے کبھی ہو جائیں تو کیا الجھن ہے
 کیا مگر کس کا گلہ ہو کہ فلک دشمن ہے
 ”نہ ہوئی گرے مرے مرنے سے تسلی نہ سہی“
 امتحان اور جو باقی ہو تو یہ بھی نہ سہی“

(1961)

شکوہ اقبال

کبھی میں حلقہ اہل ورع میں تھا مردود
میرے خلاف تھے فتوے کبھی فقیرہانہ

اور آج یوں ہے کہ مسجد میں برسہ نمبر
مرے کلام کی دیتے ہیں داد مولانا

بے انقلاب زمانے میں آگیا کیسا
ہوا ہے ابلھہ مسجد ہی میرا دیوانہ

کبھی جنوں ہے کبھی کفر ہے مری ہربات
کبھی مرے یہی اقوال ہیں حکیمانہ

نہ صرف شیخ حرم ناقدان فن بھی یہ اب
عقیدتوں کا مجھے دے رہے ہیں نذرانہ

بتار ہے وہ ایگزیسٹنسٹ مجھے
یہ کیمپونزم کا کہتے ہیں مجھ کو دیوانہ

انھیں لقین کہ مراف کر آمرانہ ہے
انھیں گماں کہ میں جمہور کا ہوں پروانہ

وصال و عشق کے مضمون یہ دل پسند ہوئے
مرے کلام کی قوالیاں ہیں روزانہ

خدا کرے کہ ہوان کی عقیدتوں میں خلوص
خدا کرے کہ حقیقت نہ ہو یہ افسانہ

بنار ہے میں کچھ اس طرح وہ مجھے جیے
”سب آشنا ہیں بہاں ایک میں ہوں بیگانہ“

میں جانتا ہوں یہ دنیا نہیں مقام مرا
گراں ہے اہل جہاں پر نہ ائے رندانہ

خلوصِ نیت ساقی پہ ہے شبہ مجھ کو
لرز رہا ہے مرا ہاتھ زیر پیمانہ

نہ ذکرِ رازی درومی نہ یاد غالب و میر
منایا جاتا ہے پر عرسِ میر اسالانہ

مجھے تو ڈر ہے اس ہنگامہ ستائش میں
دبانہ دیں یہ کسی میری آہ رندانہ

”نہ میرے لفظ ہیں محفوظ اب نہ فکر مرا
کہ میں ہوں محروم رازِ درونِ بیمانہ“

”واہ“

یہ کس جگہ کا نام لیا تو نے دوست ”واہ“
یادش بخیر دل سے نکلتی ہے ایک آہ

پہلے بھی ایک واہ کی ہوتی تھی فیکری
تیار جس میں ہوتی تھیں اشتیائی شاعری

تھا اس کی صنعتوں میں یہ افراط کا عمل
ایک ایک دار سے ہاں بنتی تھی اک غزل

وہ صنعت قیدِ قید تو اب یاد کار ہے
کہتے ہیں اسلوک کا یہاں کار و بار ہے

ہے یوں تو شاعر میں بھی اک اسلوگ کا نگ
ہوتی ہے بزم شعر میں ہر خط ایک جنگ

شاعر پہ جو گزرتی ہے وقت سخن نہ پوچھ
ہوتے ہیں وضع شعر میں کیسے محن نہ پوچھ

مضمون اور بحث میں ہے کشمکش اگر
ہیں قافیہ ردیف سے جنگ آزمادھر

محبوب ہے تو تیر و تبر سے سجا ہوا
میدانِ شعر جنگ کا نقشہ بنا ہوا

چڑ کے زبان کے تیز نگاہوں کے چلتے ہیں
شاعر کے ہونٹ شعلہ عارض سے جلتے ہیں

لیکن فقط یہی نہیں میدان کا رزار
یہ ہے بڑا جہاد دیہاں معمر کے ہزار

محبوب سے توحضرت شاعر نست بھی لیں
پر غسم یہ ہے کہ فکر کی میسران میں تلیں

یہ ارزو ہے سب پر فضیلت نصیب ہو
نقاد دوستوں کو ہنریت نصیب ہو

چھپ چھپ کے دار ہوتے ہیں نہیں کے لکھتے ہیں
تشبیہ سے کٹائے سے یوں کام چلتے ہیں

بس مختصر یہ ہے کہ بزرگانِ محترم
اک دورِ سرد جنگ کے ہیں آفریدہ ہم

شاعر کام کر کہ کسی غازی سے کم نہیں
یہ فن بھی فنِ اسلامی سے کم نہیں

طیڈی

دنیا ہے اک فسانہ و تغیر و انقلاب
 ہوتی ہے ایک ایک ورق بندی یہ کتاب
 کل تھیں حقیقتیں جو ہوئی ہیں خیال و خواب
 ہر صبح چاک کرتی ہے اک رات کا نقاب
 پیری مگر ہے اٹھتی جوانی سے سرگراں
 اب اعتدال ہے نہیں اور نہ دیاں

وہ مفترض ہیں جیسے پیری کوئی ہے شے
 پاجامہ آدھا اس کی جگہ ہو تو ٹھیک ہے
 حلیہ پہ شیخ جی کے انھیں اُری ہے قے
 ان کی نوالگ ہے تو ان کی جدا ہے لے
 موضوع اس طرح کچھ بالحھ کر سمت گیا
 اس شکمش میں جسم سے جامہ پٹ گیا

ان سے ادب کے باب میں کیجیے اگر کلام
کہتے ہیں تیوریوں کو چڑھا کر خوبستہ کام
حد ہے کہ ہو گئی ہے جوانی، ہی اتنا مام
کچھ بات عقل کی ہو تو جائز ہے احترام
پہلے فقط لب اس تھا ب طور دیکھنے
ضد نے چڑھا دیا ہے انہیں اور دیکھنے

یہ عمر کام کی یہ مشاغل نئے نئے
تکرار ان سے ہے کبھی ان سے مقابلے
کس طرح ہر قدم پر دل و جان وارتے
پھرتے ہیں اک جہاں میں ہیر و نمایا بنے
نظم حیات جیسے ہو نضمیں فلم کی
فت پا تھے ہو گئی انھیں سکریں فلم کی

آدم کے یہ سپوت تو اس زنگ سے ڈلتے
حوالک بیٹیوں کا قدم اب کہاں ہے
داماں وجیب تنگ ہیں گیسو کٹے کٹے
پکھ خم ادھر بڑھتے تو ادھر زاویے لگھتے
پیکر کو پیر ہن میں پردنے کی کوششیں
کوزے میں بحسر کو یہ سمنے کی کوششیں
سانچے میں ڈھالتی ہے جو نقش جمال کو
اس تنگ دامنی پہ ذرا غور تو کرو
پڑتا ہے اک قدم جو اٹھاتے ہیں پاؤں دو
جیسے پل صراپہ پلنے کی مشق ہو
دو پیر چار سے ہوئے حسنِ بشر بڑھا
اب یہ کھلا کہ ایک ہی ہوتا تو خوب تھا

القصہ زنگ یہ سحر و شام دیکھئے
 ان کی روشن پر ان کا ہرقdam دیکھئے
 وہ پسختہ کار لوگ ہیں یہ خام دیکھئے
 اہل نظر ہیں مور دِ الزام دیکھئے
 ان کی کمیں کہ ان کی کمیں کس طرح رہیں
 دونوں کو ہیں شکاستیں اب کس سے کیا کمیں

محوت ماشہ ہے یہ نگاہِ زمانہ ہیں
 ان کو ہوا ہے عظمتِ باضنی پہ گریقیں
 ان کی نگاہ ہیں مطلع فردِ اپہ جا لگیں
 کیا ہو رہا ہے آج کوئی دیکھنا نہیں
 ”ہے جستجو کہ خوب سے ہے خوب ترکماں
 اب بُھرتی ہے دیکھئے جا کر نظر کماں“

عبرت سراۓ دہر میں گرآنکھ کھولئے
 لازم ہے ایک حرف زبان سے نہ بولئے
 پھر نے خرابِ خوب کے میعاد کو لئے
 پر ناصحوں کی بات پر کھٹے نہ تو لئے
 تسلیس میرے حال پہ ان کو ہے اب ذرا
 ”یہ ورنہ ہر لباس میں ننگ وجود نہا“

(1962)

ناؤں افسانے

ماڑو پزو	گاؤں فادر
لیو ٹائی	حاجی مراد
البرٹ کامیو	اجنبی
شفع قیل	جاپان کی عوای کمانیاں
ہانر ش بول	کیتھارینا بلوم کی کھوئی ہوئی عزت
بریخت	ملہ کا اور کوت
ارنسٹو سہاتو	سرگنگ
آندریف	چھانسی
مرتب: اقبال یصر	ڈیکور کے شاہکار افسانے
مرتب: ملک اڈفاق	کلیات خلیل جران
مرتب: ملک اڈفاق	خلیل جران کے شاہکار افسانے
اجیت کور	کوری
اجیت کور	فالتو عورت
اجیت کور	دھوپ والا شر
اجیت کور	پبلی ادای
یو گیش کمار	ٹونتے بکھرتے اوک
فیور دوستونیف-سکی	ذاتوں کے مارے اوک
ہم کن دیسے	سدھار تھے
میکسیم کورکی	ماں
ہنری ڈی بالزاک	تاریک راہوں کے مسافر

فکشن ہاؤس

۱۸۔ فرنگ سود، لاہور

